مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اُسی رُخ چلنا پڑا۔ مگر جس لیک پر قافلہ جارہا تھا اُسکے سوا ایک اور لیک اُسی کے متوازی اپنے لئے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اُس چال کو چھوڑکر دوسری چال اختیار کی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب میر و سودا اور اُن کے مقلدین کے کلام میں ایک ہی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اُکتا جاتا ہے اور اُسکے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ہیں تو اُسمیں ہمکو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ہے؛ اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں، یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جاکر، ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاہدہ کرتا ہے؛ اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ہی سماں نظر آتا ہے۔ یہاں اول ہم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ہیں جن سے اُنکے خیالات کا اچھوتا پن ثابت ہوتا ہے

"بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے؛ مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے دعوے یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے اُسکا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے؛ بلکہ شاعرانہ استدلال ہے۔ جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کرسکتا۔

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا"

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ کیونکہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ

صرف اِس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اُسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے۔ اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انکاری زیادہ کرتا ہے۔

"نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا"

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے؛ اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرع کے معنی ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرع سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا بُرائی ہوتی؛ مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا؛ مطلب یہ کہ خدا ہوتا؛ کیونکہ پہلے مصرع میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے۔ اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُسکو ادا کیا گیا ہے۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُسکی فہم کا قصور ہے۔ دعوے یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اُسی کے موافق اُسکی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرۂ اشک جسکو آنکھوں میں جگہ ملی ہے۔ اگر اُسکی ہمت، جبکہ وہ دریا میں تھا موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اُسکو۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا۔

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

لاگ دشمنی اور لگاؤ محبت۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو؛ مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اِس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ بندھا ہوگا۔ مطلب

یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی، اگر دشمنی بھی ہوتی تو۔ اِس لئے کہ اسمیں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم اُسی کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب نہ دوستی ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پہ دھوکا کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاو ایسے دو لفظ بہم پہونچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چار چند کر دیا ہے۔

فضیلت نوعِ انسانی

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

اِس شعر میں اِس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اُسکے متحمل نہوئے، اور ڈر گئے، اور انسان نے اُسکو اُٹھا لیا،، شاعر کہتا ہے کہ برقِ تجلّی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہِ طور، کیونکہ شراب خوار کا ظرف دیکھکر اُسکے موافق اُسکو شراب دی جاتی ہے؛ پس کوہِ طور۔ جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلّی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بھی مع اِس تمثیل کے جو اُسمیں بیان ہوئی ہے بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے۔

شوخی

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا، اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اِس لئے پہلا مصرع اُردو روزمرّہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے۔ جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کرینگے جو پہلے ہی دیجا چکی ہو۔

شوخی

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھسے مِرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اِسمیں بھی نئی طرح کی شوخی ہے۔ جو بالکل اچھوتی ہے۔ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھسے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ؛ اور در پردہ الزام دیتا ہے؛ گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں؟ وہ شمار میں اِس قدر زیادہ ہیں کہ جب اُنکو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تونے دنیا میں دیے ہیں، اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُنکی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدمِ استطاعت کے اُسکو خاطر خواہ نکر سکا؛ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہوا؛ اور وصل میسّر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

شکایت اہلِ وطن

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دُور
رکھ لی مِرے خدا نے مِری بیکسی کی شرم

پردیس میں مرنا۔ جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اُسپر خدا کا اِس لئے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں، کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؛ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو، مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہو، وہاں مُردے کی اِس طرح مٹّی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلّت کی بات تھی؛ پس خدا کا شکر ہے کہ اُسنے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اِسمیں گو بظاہر خدا کا شکر ہے مگر فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے۔ جسکو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

تصوف

ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجوداتِ عالم میں حق ہی حق نظر آئے اِسکو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیّتِ ذات ہے جو عقل وادراک و بصر و بصیرت سے ورا الورا ہے۔ کہتا ہے کہ جسکو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے۔ اور اُسکو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں؛ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے؛ اور اِس سے بہتر اِس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی۔

عاشقانہ

نظر لگے نہ کہیں اُسکے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اُسکے زخم کی گہرائی اِس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اخلاق

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھپر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے؛ اور نرا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے؛ اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اُس سے زیادہ تصوّر میں نہیں آسکتا۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضدِ حقیقی یعنی اُنکے آسان ہو جانے۔ سے کرنا درحقیقت حُسنِ مبالغہ کی معراج ہے۔ جس کی نظیر آجتک نہیں دیکھی گئی۔

عاشقانہ

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اِس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لیجاؤ، اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونو صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہوتا۔ یعنی دشوار ہوتا۔ تو کچھ دقت نہ تھی؛ کیونکہ ہم مایوس ہو کر

بیٹھ رہتے، اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے؛ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں؛ اور اِس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی۔

وفاداری

وفاداری بشرطِ اُستواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بتخانے میں کاٹ دے، اور وہیں مر رہے، تو وہ اِس بات کا مستحق ہے کہ اُسکو کعبے میں دفن کیا جاے؛ کیونکہ اُسنے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا؛ اور یہی ایمان کی اصل ہے۔

تصوف

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اِس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شرابِ طہور وغیرہ ملے گی؛ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے تاکہ یہ لالچ باقی نرہے اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

حسن بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُسنے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حُسنِ بیان کی اِس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے مُنہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اِس طرح اُتر جاے کہ اُسکو یہ شبہہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

اخلاق

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جامِ جم پر جامِ سفال کو کس خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اُسکی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گذرا۔

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہونے سے ۔۔۔ بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو مگر تمثیل نے اسکو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہلِ ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھکر اُسکی طرف التفات نکرتے تو دنیا ویران ہو جاتی پس یہ جاننا چاہئے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہلِ ہمت مفقود ہیں یعنی جسطرح میخانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ میخانے میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے کہ اُسمیں اہلِ ہمت معدوم ہیں۔

ناامیدی

منحصر مرنے پہ ہو جسکی امید ۔۔۔ ناامیدی اُسکی دیکھا چاہئے

ناامیدی کی غایت اس سے بڑھکر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔۔۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہمنے کئے ہیں اگر انکی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور اُنکی حسرت دل میں رہ گئی اُنکی داد بھی ملنی چاہئے۔

علاوہ جدتِ مضامین اور طرفگیِ خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اولاً عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے اُن تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے؛ بلکہ تقریباً ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے؛ بلکہ خیالات کی جدت اُن کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اُن کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں۔ مثلاً سانس کو موج سے،

بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغزِ سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقدِ وبال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالبِ خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں اُنکے ابتدائی ریختہ میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اُسی قدر تشبیہوں میں۔ باوجود ندرت اور طرفگی کے۔ سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

مثال ۱

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام ۔۔۔ مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یہاں

یہاں سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں۔ چراغِ رہگذرِ باد سے تشبیہ دی ہے؛ جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

مثال ۲

دوسری جگہ سورج کو۔ اس لحاظ سے کہ حسنِ معشوق کے مقابلے میں اُسکو ناقص الخلقۃ قرار دیا ہے۔ ماہِ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ۔۔۔ خورشید ہنوز اُسکے برابر نہوا تھا

مثال ۳

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اُسکو غم سے نجات نہیں ہوتی۔ شمع سے تشبیہ دی ہے؛ کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں۔

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج ۔۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس قسم کی بدیع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونو دیوان اردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے حصے میں بیان ہو چکا ہے ابتذال سے

بہت بچتے تھے۔ مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں جس قدر اُنکے کلام میں کم ملینگی ظاہرا کسی ریختہ گو شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتیں مثلاً صلِّ علیٰ کا لفظ جو بجاے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اُسکو وہ کبھی جائز نہیں رکھتے تھے یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عوام الناس کی زبان پر جاری ہیں۔ اور خواص اُنکو کبھی نہیں بولتے تا بمقدور وہ اُنکو استعمال نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہوجاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہیئے وہ فوت ہوجاتا ہے مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہمکو معلوم ہوئی ہیں اُن کا بیان کرنا ضرور ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو۔ جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے،، اور جسکی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے۔ ریختہ میں بھی نسبتاً فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا۔ اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلا شبہہ استعمال کیا ہے؛ لیکن استعارے کے قصد سے نہیں بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں استعارے بلا قصد اُنکے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کیجاتی ہیں۔

بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا　　　بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اِس مطلب کو۔ کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھادی تو اِس سے کیا تسلی ہوسکتی ہے۔ اِسطرح ادا کیا ہے ”بجلی اِک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا“

؂ مرزا کہتے تھے کہ حرف جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے۔

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　　پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا“

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گذری تھی اور جو اُسکے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اُسمیں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہوجاتا ہے اُسکو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے۔ ایسے بلیغ شعر اُردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گذرتی ہے اِن دو مصرعوں میں اُسکی تصویر کھینچدی ہے جس سے بہتر کسی اسلوبِ بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہوسکتا۔

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ　　　دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اِس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اِس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے　　　اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اِس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمکو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں　　　جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اُسوقت اُنکے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

اِن اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں؛ مگر استعارے و تمثیل نے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کردی ہے۔

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں، اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں، اور کیا نثر میں۔ باوجود سنجیدگی و متانت کے۔ شوخی و ظرافت ہے؛ جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا۔ مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گذرے ہیں؛ ایک سودا، دوسرے انشا؛ مگر دونو کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجوگوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی؛ بخلاف مرزا غالب کے کہ اُنھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبانِ قلم کو آلودہ نہیں کیا۔

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرزِ ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے؛ اور جسکو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جا سکتا ہے؛ اُنکے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلودار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اُس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں؛ مگر غور کرنے کے بعد اسمیں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں؛ جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں۔ لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں۔

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اِس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اِس قدر ویران ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر یاد آتا ہے؛ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اِس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہوگی؛ مگر دشت بھی اِسقدر ویراں ہے کہ اُسکو دیکھکر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریفِ مَےِ مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

اِس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مرگیا ہوں مَےِ مرد افگنِ عشق کا ساقی۔ یعنی معشوق۔ بار بار صلا دیتا ہے؛ یعنی لوگوں کو شرابِ عشق کی طرف بُلاتا ہے۔ مطلب یہ کہ میرے بعد شرابِ عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا؛ اِس لئے اُسکو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے: مگر زیادہ غور کرنے کے بعد۔ جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اِسمیں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع یہی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں؛ اور اِس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بُلانے کے لہجہ میں پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مَےِ مرد افگنِ عشق"، یعنی کوئی ہے جو مَےِ مرد افگنِ عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اِس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اِسی مصرع کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے "کون ہوتا ہے حریفِ مَےِ مرد افگنِ عشق" یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اِسمیں لہجہ اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے؛ کسی کو بُلانے کا لہجہ اور ہے؛ اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اِس طرح مصرعِ مذکور کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائینگے۔

کیونکہ اُس بُت سے رکھوں جان عزیز   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اِسکے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اُس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لیگا؛ اِسلیے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بُت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے؛ پھر اُس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند   گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

اِسکے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری

نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اُسکو گوارا نہوتی؛ اور یا اب ہمکو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اُس قصّے کی طرف اشارہ ہے جو قرآنِ مجید میں مذکور ہے؛ کہ جب خدا تعالےٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا "کیا تو دنیا میں اُس شخص یعنی اُس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اُسمیں فساد اور خونریزی کرے؟ وہاں سے ارشاد ہوا کہ "تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں"، اور پھر آدم سے اُنکو زک دلوائی؛ اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی۔

مثال ۹

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اسکے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروِ قامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنا یا گیا ہے؛ اسلیے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔

مثال ۱۰

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہمکو

اس شعر میں "ترے سر کی قسم ہے ہمکو" اس جملے کے دو معنی ہیں؛ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اُڑائینگے۔ اور دوسرے یہ کہ ہمکو تیرے سر کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اُڑائینگے جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے۔ یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

مثال ۱۱

اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اسکا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تمکو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر

فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

مثال

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا بس چپ رہو ہمارے بھی مُنھ میں زبان ہے

"ہمارے بھی مُنھ میں زبان ہے" اسمیں دو معنی رکھتے ہیں؛ ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تمکو قائل کر دینگے؛ اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھکر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں۔

مثال

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

"کون اُٹھاتا ہے مجھے"، اسکے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اُٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اُٹھاتا ہے؟ اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اُٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اُٹھاتا ہے۔

مثال

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اسمیں بادپیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیے ہیں؛ بادپیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں؛ پس ایک معنی تو اسکے یہ ہیں کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اُسمیں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض بادپیمائی یعنی فضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا؛ اور بادپیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ بادپیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے؛ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح بادپیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لئے جائیں۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے۔